بالغیب لے آئیں، اس کو معلوم کرنے کی کوشش سرے سے غلط ہے، دراصل وہ معلوم کرنے کی چیز ہی نہیں ہے، صرف ایمان لانے کی چیز ہے۔ تم جن مقامات سے گذرے وہ سلوک کی ادنی منزلیں ہیں۔ وہاں ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ وجود ایک ہے اور اس ایک کے سوا کچھ موجود نہیں، مگر یہ صرف وحدت شہود ہے (یعنی ایسا نظر آتا ہے) وحدتِ وجود نہیں ہے (یعنی فی الواقع ایسا نہیں ہے)۔ ان بیچ کی منزلوں میں جو واردات سالک پر گذرتے ہیں، ان پر اعتماد کرنا غلطی ہے، اسلیے کہ اس راہ کا بے خطا اور بے امکانِ خطا علم اگر کسی کو ملا ہے تو وہ صرف صاحبِ وحی کو ملا ہے۔ پس صاحبِ وحی کا علم اصلی معیار ہے اور سالک کے لیے لازم ہے کہ منازلِ سلوک میں سے ہر منزل پر جو کچھ اُسے محسوس ہو اُسکو اس معیار پر جانچ کر دیکھے، اسکے مطابق ہو تو سمجھے کہ صحیح ہے اور اس سے مختلف ہو تو نظر کا دھوکا سمجھ کر رد کر دے۔ ورنہ اگر علم وحی کے اتباع سے آزاد ہو کر خود اپنے مشاہدے پر اعتماد کرے گا تو غلطی کرے گا، اور اگر اپنے مشاہدات کی روشنی میں وحی کی تاویل کرے گا تو اس سے بھی عظیم تر غلطی کرے گا۔ شیخ مجدد نے اس خیال کا صرف اظہار ہی نہیں کیا بلکہ وحدت الوجود کے خلاف پیہم تبلیغ کر کے اسکے اثرات کو مٹانے کی زبردست کوشش کی اور اُن کا یہ کارنامہ اُن بڑے کارناموں میں سے ایک ہے جن کی بدولت انہیں مجدد الف ثانی کا لقب دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر برہان احمد صاحب نے اس کتاب میں شیخ کے اسی کارنامہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انہوں نے ابتدا میں مجدد صاحب کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ پیش کر کے انکی شخصیت سے ناظرین کا تعارف کرایا ہے۔ پھر پوری تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ فلسفیانہ (یا خیالی و نظری) توحید اور مذہبی توحید کے مبدا، غایت، مقتضیات، لوازم، اور نوعیت میں بنیادی فرق کیا ہے اور نہایت تشفی بخش دلائل سے ثابت کیا ہے کہ صوفیۂ وجودیہ کی اصلی غلطی جسکی وجہ سے وہ صراط مستقیم سے ہٹ گئے یہ تھی کہ انہوں نے فلسفیانہ توحید اور مذہبی توحید کے اصولی فرق کو نظر انداز کر کے دونوں کو عجیب طرح خلط ملط کر دیا۔ یہ بحث دراصل اس

کتاب کی جان ہے اور اس سے جس خوبی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب عہدہ برا ہوئے ہیں وہ مستحق داد ہے اسکے بعد انہوں نے ابن عربی کی نیم فلسفیانہ و نیم مذہبی توحید کی تشریح کی ہے اور پھر مجدد صاحب کے ان دلائل کو پیش کیا ہے جن سے وہ ابن عربی کی تردید اور اپنے تصور توحید کا اثبات کرتے ہیں۔ آخر میں انہوں نے ان بحثوں کا خلاصہ دیا ہے جو مجدد صاحب کے بعد ایک مدت تک ہندوستان میں ابن عربی کے حامیوں اور مجدد صاحب کے پیروؤں کے درمیان برپا رہیں اور انکے درمیان محاکمہ کرکے ثابت کیا ہے کہ اسلام کی اصلی توحید وہی ہے جسے شیخ مجدد نے فلسفیانہ تصوف کے ظلمات سے نکال کر از سر نو نمایاں کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے اس مقالہ پر علی گڑھ یونیورسٹی نے ان کو پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری دی ہے اور حق یہ ہے کہ ان کا یہ کام اس اعتراف کا پورا مستحق تھا۔

انسانی کام کوتاہیوں سے خالی نہیں ہوتے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی چند کوتاہیاں ہیں۔

صفحہ ۵۰ سے ۵۲ تک ڈاکٹر صاحب نے مذہبی شعور کے مبدا کی جو تشریح کی ہے اسکو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا مذہب میں خدا اور اسکی صفات کا جو تصور ہے وہ اُس طلب سے پیدا ہوا ہے جو مشکلات اور مزاحمتوں سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے آپ کو ضعیف و بے چارہ پاکر ایک خدا، اور ایسے ایک خدا کے لیے انسان کے اندر فطری طور پر ابھرتی ہے۔ حالانکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ انسان کے اندر صرف طلب ہی طلب ہے، مطلوب کا کوئی صحیح اور متعین تصور مجرد اس طلب سے پیدا نہیں ہوتا۔ مطلوب کون ہے اور کیسا ہے ("ہونا چاہیے" نہیں بلکہ "ہے") یہ بات خود مطلوب کی طرف سے آئے ہوئے نبی بتاتے ہیں اور انسان کی اسی اندرونی طلب سے اپیل کرتے ہیں کہ جسے تو ڈھونڈ رہی تھی وہ یہ ہے۔ اگر نبی کے بغیر انسان خود اپنی اندرونی طلب کے اشاروں سے اُس کا سراغ لگائے تو کبھی اسکی ذات و صفات کے متعلق ایسے صحیح اور مکمل تصور تک نہیں پہنچ سکتا، اور واقعہ یہ ہے کہ کبھی نہیں پہنچ سکا، کیونکہ اندرونی طلب کے اشارے بہت خفی ہیں، استدلال کے پاؤں کمزور ہیں، اور ہوائے نفس کا رہزن

ہر وقت راہ مارنے کے لیے مستعد ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کا مافی الضمیر وہ نہیں ہے جیسا اس مقام پر انکی بحث سے ظاہر ہوتا ہے، مگر انکے بیان کا انداز ایسا ہے جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا قوی امکان ہے۔ بہتر ہو کہ آئندہ ایڈیشن میں وہ ایک نوٹ لکھ کر اس غلط فہمی کا سدباب کر دیں۔

صفحہ ۹ اور صفحہ ۷ کے حاشیوں میں انہوں نے چند اصطلاحات کی تشریح میں غلطی کی ہے۔ اجماع کو انہوں نے اسلام کا تیسرا ماخذ بتایا ہے۔ حالانکہ اول تو اجماع دراصل اسلام کا نہیں بلکہ احکام شریعت کا ایک ماخذ ہے، اور پھر وہ مستقل بالذات ماخذ نہیں بلکہ تابع کتاب و سنت ہے۔ چونکہ تمام مسلمان مل کر بھی شارع نہیں بن سکتے، اسلیے مسلمانوں کا مجرد کسی امر پر اتفاق اُس کو شریعت نہیں بنا دیتا، بلکہ شریعت میں حجت صرف وہ اجماع ہے جسکی اصل کتاب و سنت میں پائی جاتی ہو۔ تقلید کی تعریف میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "کسی خاص امام کے اجماع اور قیاس کو بجائے قرآن و حدیث کے ماخذِ اسلام ماننا تقلید ہے"۔ یہ صریحاً غلط ہے۔ تقلید کی صحیح تعریف "کسی امام کے اجتہاد و استنباط پر اعتماد کرنا اور خود براہ راست کتاب و سنت سے احکام اخذ نہ کرنا" ہے۔ غیر مقلد کی تعریف ڈاکٹر صاحب نے یہ کی ہے کہ غیر مقلد وہ ہے جو اجماع اور قیاس کو ماخذ اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

صفحہ ۱۴ کے حاشیہ میں "در اطیعوا الرسول خجالتہا دارم" کا ترجمہ مصنف نے یہ کیا ہے کہ "میں اطیعوا الرسول سے غفلت کرنے پر شرمسار ہوں"۔ حالانکہ صحیح مفہوم یہ ہے کہ "مجھے اطیعوا الرسول ہی میں شرمندگیاں لاحق ہوتی ہیں"۔

صفحہ ۲۰ پر ڈاکٹر صاحب نے "اسلامی بادشاہی" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ ایسی ہی متضاد ترکیب ہے جیسے "سفید سیاہی"۔ اسلام تو صرف ایک بادشاہ کو جانتا ہے جس کا نام اللہ ہے۔ کسی دوسرے کی بادشاہی اسے تسلیم ہی نہیں۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

قستت رجال بالملوك سفاهة — ولا ملك الا للذی خلق الملكا

یعنی آدمیوں نے کم ظرفی و نادانی سے اپنے آپ کو بادشاہ کہا حالانکہ دراصل بادشاہی اسی کی ہے جس نے ملک کو پیدا کیا۔

صفحہ ۲۹ پر ڈاکٹر صاحب نے نبوت کو انگریزی لفظ "پرافسی" کا ہم معنی بتایا ہے۔ حالانکہ دونوں کا مفہوم بالکل مختلف ہے۔ نبوت کے لغوی معنی خبر دینے کے ہیں اور اصطلاحاً نبوت کا مفہوم غیب کی اطلاع دینا ہے۔ بخلاف اسکے پرافسی کا مفہوم آئندہ کی خبر دینا یا پیش گوئی کرنا ہے۔ عیسائی اور یہودی بیچارے اپنے ذہن کی تنگی کے سبب سے پیش گوئی ہی کو بڑا کام سمجھتے تھے اور اس سے بالاتر نبوت کے کسی مفہوم سے آشنا نہ تھے اسلیے انہوں نے کاہنوں کو نبی اور نبیوں کو کاہن سمجھا اور وہی "پرافٹ" کا لفظ انبیاء کے لیے استعمال کیا جو کاہنوں پر صادق آتا تھا۔

صفحہ ۳۴ پر لفظ سنت کا ترجمہ ڈاکٹر صاحب نے "عادت" کیا ہے اور اصطلاحی مفہوم "نبی صلعم کے عادی افعال" بتایا ہے۔ حالانکہ سنت کا صحیح ترجمہ "طریقہ" ہے اور اصطلاحاً اس سے مراد نبی صلعم کا وہ طرز زندگی ہے جو اتباع کے لیے نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

صفحہ ۳۹ و ۴۰ پر ڈاکٹر صاحب نے سرسید اور مولوی عبداللہ چکڑالوی کے متعلق جو نوٹ لکھے ہیں وہ نظر ثانی کے محتاج ہیں۔ اول تو ان دونوں حضرات کا ذکر مجدد صاحب، شاہ ولی اللہ صاحب، شاہ اسماعیل شہید اور سید احمد بریلوی کے سلسلہ میں لانا یہ غلط فہمی پیدا کرتا ہے کہ گویا یہ بھی اسی سلسلہ کے آدمی ہیں۔ وشتان ما بین ھٰؤلاء و ھٰؤلاء۔ پھر سرسید کے کام کو "اصلاح" اور "تنقید عالی" کے الفاظ سے تعبیر کرنا اور یہ کہنا کہ "مسلمانوں میں انکے بعد جتنی اہم مذہبی، سیاسی، اجتماعی، ادبی و تعلیمی تحریکیں اٹھیں ان سب کا سررشتہ کسی نہ کسی طرح اُن سے ملتا ہے"، دراصل مبالغہ کی حد سے بھی بہت متجاوز ہے۔ علی گڑھ کے تعلق کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو خواہ سرسید سے کتنی ہی ارادت ہو، مگر جب وہ ایک مسلمان محقق کی حیثیت سے سامنے آرہے ہیں تو انہیں بے لاگ حق کا اظہار کرنا چاہیے۔ سچ یہ ہے کہ

۱۸۵۷ء کے بعد سے اب تک جس قدر گمراہیاں مسلمانوں میں پیدا ہوئی ہیں ان سب کا شجرۂ نسب بالواسطہ یا بلاواسطہ سرسید کی ذات تک پہنچتا ہے۔ وہ اس سرزمین میں تجدد کے امام اول تھے اور پوری قوم کا مزاج بگاڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ رہے مولوی عبداللہ چکڑالوی تو ان کو "قرآن کا بڑا عالم" کہنا قرآن پر ظلم ہے۔ ایک بہکا ہوا آدمی جسکے ذہن کا توازن بگڑا ہوا ہو علم قرآن کی دولت سے کچھ بھی بہرہ نہیں پا سکتا۔

صفحہ ۸۰ پر مصنف نے صاحب حکمتہ الاشراق کا نام شیخ شہاب الدین سہروردی لکھا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ شائد یہ وہی طریقہ سہروردیہ کے بانی ہیں۔ حالانکہ وہ شہاب الدین سہروردی اور ہیں۔ اس التباس کو دور کر دینا مناسب ہے۔

صفحہ ۱۳۵ پر مصنف نے قل الروح من امر ربی کا مطلب، عام غلط فہمی کے اتباع میں "روح امر رب ہے" بتایا ہے۔ حالانکہ قرآن یہ نہیں کہتا کہ روح خود امر رب ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ "روح امر رب سے ہے"۔ لفظ من کو نظر انداز کر دینے سے مفہوم کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ یہ کتاب انگریزی میں ہے۔ فلسفیانہ تصوف کے مارے ہوئے لوگ تو اصل میں اردو خواں ہیں۔ ان مارگزیدوں کو انگریزی تریاق کیا کام دیگا۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ اردو میں شائع کیا جائے۔

اسلام کا اقتصادی نظام | تالیف مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی۔ ضخامت ۲۴۸ صفحات۔ قیمت عہ۔ ندوۃ المصنفین۔ قرول باغ۔ دہلی۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس کتاب میں اسلام کے معاشی احکام و قوانین کو ایک نظام کی شکل میں مدون کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتانا چاہا ہے کہ یہ نظام کس طرح دنیا کے موجودہ معاشی مسائل کا ایک صحیح و متوازن حل پیش کرتا ہے اور کن وجوہ سے دوسرے نظامات معیشت کے مقابلہ میں لائق ترجیح ہے۔ انکی یہ کوشش اس لحاظ سے ضرور قابل قدر ہے کہ

انہوں نے معاشی معاملات کے متعلق قرآن و حدیث اور فقہی کتابوں میں سے کافی مواد جمع کر دیا ہے جو بجائے خود نہایت مفید ہے لیکن اپنی تصنیف کا جو مقصد انہوں نے بیان کیا ہے اُسکے لحاظ سے ہم اسکو ایک ناکام کوشش کہنے پر مجبور ہیں۔ علم المعیشت سے انکی فنی واقفیت محض سرسری نوعیت کی معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے فراہم کردہ مواد کو سائنٹفک طریقہ پر مرتب کرنیکے بجائے عجیب طریقہ سے بکھیر دیا ہے جس سے اسلامی نظام معیشت کا کوئی واضح نقشہ ذہن میں نہیں بنتا۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک علمی بحث نہیں ہے بلکہ اشتراکیوں کو راضی کرنے کی ایک تبلیغی کوشش ہے۔ پھر جہاں انہوں نے دوسرے معاشی نظاموں سے اسلامی نظام کا تقابل کیا ہے وہاں تو انکی ناواقفیت بُری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ فاشزم اور مارکسزم دونوں کے متعلق انکی معلومات نہایت ناقص بلکہ غلط ہیں۔ اور اسی ناقص علم کی وجہ سے انہوں نے بے تکلف یہ نتیجہ نکال لیا ہے کہ فاشزم کی بہ نسبت مارکسزم اسلام سے اقرب ہے، حالانکہ دونوں اسلام سے یکساں دور ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے جسقدر لعنت کے قابل فاشزم ہے اسی قدر مارکسزم بھی ہے۔

کتاب کا سب سے زیادہ افسوسناک حصہ وہ ہے جہاں ہندوستان کے موجودہ حالات پر مصنف نے اپنے نظریات کو منطبق کرنیکی کوشش کی ہے۔ اس مقام پر سب سے پہلے تو وہ حاضر الوقت معاشی نظام میں انقلاب کی ضرورت ظاہر کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں کہ یہ انقلاب دو نظریوں میں سے کسی ایک نظریہ ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ ایک خالص اسلامی نظریہ۔ دوسرا وہ نظریہ جو اسلامی نظریہ کے اصولوں سے قریب تر ہو (یعنی اشتراکی نظریہ)۔ اور آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ

"بلا خوف و منہ لائم اسلامی بصیرت کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اس ملک میں سردست پہلا نظریہ جامۂ عمل نہیں پہن سکتا بلکہ دوسرا نظریہ ہی ممکن الوقوع ہے۔"

۲۳۲ صفحہ کی بحث کے بعد یہ نتیجہ جس پر ہر لائم کی ملامت سے بے خوف ہو کر جناب مولانا پہنچے ہیں، انکی اُس تمام محنت پر پانی پھیر دیتا ہے جو انہوں نے اسلامی نظام معیشت کی خوبیاں بیان کرنے میں صرف فرمائی ہے۔ جو چیز سردست جامۂ عمل پہن ہی نہیں سکتی، بہتر تھا کہ سردست اُسکی شرح و تفسیر میں بھی وقت ضائع نہ کیا جاتا۔ پھر وہ اشتراکیت جسکو وہ اپنی عجیب و غریب "اسلامی بصیرت" کی بنا پر اسلامی نظریہ سے قریب تر سمجھ رہے ہیں، چند ظاہری